L. No. 218667 | Regd. No. 227

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخِ اشاعت
۲۲-۱۵-۸-۱

ٹیلی فون - ۶۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

جلد ۲۲ - شمارہ ۴۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | ۱۵ر نومبر ۱۹۶۳ء

آل احمد سرور

لال قلعے میں

ہجوم "شوق" نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
(تصرف کے لئے غالبؔ سے معذرت کے ساتھ)

۷ر نومبر ۱۹۶۳ء کو لال قلعے کے در و دیوار نے ایک ایسا روح پرور منظر دیکھا، جس کا ایک عرصۂ دراز سے اُنھیں انتظار تھا۔ دہلی اس کے لئے بے تاب تھی، ہندوستان اس کے لئے مضطرب اور مشتاق تھا۔

ایک سو ایک سال پہلے ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں آخری مغل تاجدار، اُردو کے ممتاز شاعر، صوفی صافی، مردِ درویش بہادر شاہ ظفر نے قیدِ فرنگ میں جان دی۔ مغل باہر سے آئے تھے، مگر ہندوستان میں بس گئے اور ہندوستانی ہو گئے۔ اُن کے دور میں ہندوستان کے تہذیب و تمدن کو اور بھی آب و تاب ملی، اُنھوں نے اپنی رواداری اور صلح کل کی پالیسی سے سب کا دل موہ لیا، اُنھوں نے اشوک کے بعد ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت دی، اُنھوں نے فنونِ لطیفہ کی ایسی سرپرستی کی کہ ہندوستان ایک نگار خانہ بن گیا۔ اُن کے اثر سے کھڑی بولی نے وہ روپ رنگ نکالا کہ اُردو بن کر بازار، خانقاہ اور دربار تک پہنچی اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کے دل کی دھڑکن اور ہونٹوں کی لے بن گئی۔ اُنھوں نے بھگتوں اور صوفیوں کی وہ قدر کی کہ اُن کے پیامِ محبت نے شیخ و برہمن کو یک جا کر دیا۔ مگر وقت کے قانون کے مطابق جب ان کے اقتدار کو زوال ہوا اور آپس کی پھوٹ سے مغرب کے تاجروں نے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کو اپنے دام میں اسیر کر لیا، تو آزادی کے متوالوں کی نگاہیں قیادت کے لئے اس مغل تاجدار کی طرف اُٹھیں جو ہماری مشترک تہذیب کی علامت تھا اور جو اپنی ذات میں صدیوں کی چمن بندی کے سارے اثرات کو سموئے ہوئے تھا۔

یہ اہم نہیں کہ بہادر شاہ کس طرح اس صف میں پہنچے، اہم بات یہ ہے کہ وہ اس تاریخی موڑ پر کہاں تھے، کس صف میں تھے اور اُن کا رول کیا تھا۔ آزادی کے متوالوں کو صرف بہادر شاہ کا در اس لئے نظر آیا کہ اس پر ساری ہندوستان کی آنکھیں جم سکتی تھیں، وہی علامت سب کے ذہنوں اور دلوں کو ایک مرکز پر لا سکتی تھی، اُسی کے جھنڈے تلے سب جمع ہو سکتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی برابر یہ کوشش رہی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی قیادت میں قابل ترین اشخاص آگے آئیں، مگر اپنوں کی رقابتوں نے اُن کی پیش نہ دی۔ اُنھوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے انگریزوں کی ہر کوشش کو ناکام بنایا مگر چھوٹی طینتوں اور محدود ذہنوں میں کشادگی اور فراخی کیسے پیدا کر دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کی یہ پہلی لڑائی ناکام ہوئی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا، اُن کے جوان بیٹوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے گولی سے شہید کیا اور اُن پر بغاوت کے

اس اشاعت میں

جرم میں مقدمہ چلایا۔ ایسا بھی اندھیر دنیا نے کم دیکھا ہوگا کہ جائز حکمراں کو باغی قرار دیا جا رہا تھا اور غاصب عدل کا ڈھونگ کھڑا کر کے اُس پر بغاوت کا مقدمہ چلا رہے تھے۔ بہر حال بہادر شاہ کو رنگون بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے ۱۸۶۲ء میں جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔

آزادی کی تحریک نے ہمیں اپنے مجاہدوں، رہنماؤں اور شہیدوں کی عظمت کا اعتراف سکھایا۔ نیتاجی سبھاش بوس نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کی قبر پر عہد کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور ظفر کی قبر کو دہلی لے جائیں گے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہر محب وطن کے دل میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ کسی طرح ظفر کو "کوئے یار" میں دو گز زمین مل جائے اور اس کی روح کی یہ آرزو پوری ہو جائے۔ ڈاکٹر تارا چند نے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ظفر کے کارنامے کی عظمت کو واضح کیا اور ۱۹۶۲ء میں بزم ظفر نے ظفر کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک خاص اجتماع کا پروگرام بنایا، مگر ہنگامی حالات کی وجہ سے اُس وقت سب باتیں ملتوی کرنی پڑیں۔

ہر محب وطن کو اس خبر سے تسکین ہوئی تھی کہ امسال لال قلعے میں ایک تاریخی اجتماع ہوگا جس میں ظفر کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا اور اس اجتماع کا افتتاح ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو فرمائیں گے۔

چنانچہ ۷ر نومبر ۱۹۶۳ء کو یہ اجتماع ہوا جس کے لئے کتنے دنوں سے دیدہ و دل فرش راہ تھے۔ لال قلعے کی دیواروں نے جاہ و جلال، عظمت و عبرت کے کتنے مناظر دیکھے ہیں، شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب کے کون سے کرشمے ہیں جو یہاں پیش نہیں کئے گئے۔ مگر یہ اجتماع اپنے اندر ایک نئی شان، ایک نئی آن رکھتا تھا۔ جمہوریت کا پرستار، شاہی سے بیزار، نیا ہندوستان، ایک بادشاہ کے سامنے سر جھکا رہا تھا۔ ہندوستان کا وزیر اعظم جو ہماری آزادی کی جنگ کا سب سے بڑا سورما اور جو ہمارے رہنما گاندھی جی کا جانشین ہے، گویا نظر کردۂ صاحبقران ہے، جو ماضی کی تمام صالح روایات کو عزیز رکھتے ہوئے نئے دور کا انسان ہے جس نے ہندوستان کو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے راستے پر چلنا سکھایا ہے، جو اپنی دلنواز شخصیت اور پرسوز طبیعت کی وجہ سے آج ایک دنیا کا محبوب ہے، وہ والہانہ، صاف الفاظ اور بے جھجک انداز میں ایک بادشاہ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کر رہا تھا، اس لئے نہیں کہ وہ محض ایک بادشاہ تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ہندوستانی تھا، ہماری مشترک تہذیب کا علمبردار تھا، ہماری قومی زبان اردو کا ایک ممتاز شاعر تھا اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ انگریزوں کے خلاف پہلی قومی جنگ اسی کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں تو ہندوستان ناکام رہا مگر آزادی کی لڑائی میں تو ناکامیاں بھی رفتہ رفتہ کامیابی کا روپ دھارتی ہیں۔

دیوان عام کی سیڑھیوں پر ایک چھوٹا سا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر پنڈت جواہر لال نہرو، بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی شہزادی قمر سلطان، ڈاکٹر تارا چند، نور الدین احمد، کرنل بشیر حسین زیدی، بیگم بھوپال اور استقبالیہ کمیٹی کے دوسرے ارکان رونق افروز تھے۔ دیوان عام میں اس طرح روشنی کی گئی تھی کہ وہ تخت منور ہو گیا تھا جس پر ظفر رونق افروز ہوتے تھے۔ سیڑھیوں کے پاس سے کرسیوں کی قطاریں تھیں اور چھ سات ہزار آدمی پنڈت جی، ڈاکٹر تارا چند اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریریں سُن رہے تھے۔ ذاکر صاحب کی تقریر ان کی عدم موجودگی میں مرزا محمود بیگ نے پڑھ کر سنائی۔

ڈاکٹر تارا چند کی تقریر ایک تاریخی دستاویز بھی تھی، ایک عاشق کا خراج عقیدت بھی تھا اور ایک عارف کا نغمۂ معرفت بھی۔ اس میں مغل دور کے کارناموں کا اعتراف تھا اور ظفر کے کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ۔ نئی دہلی نے پرانی دہلی کی یاد میں سر جھکایا تھا، مورخ نے اپنے ایک ہیرو کی عظمت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس دور کے ایک عالم، دانشور اور مایۂ ناز فرزند نے ایک بزرگ قوم کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ حال نے ماضی کو اپنایا، اُس پر فخر کیا اور اُس سے مستقبل کے لئے نیا ولولہ حاصل کیا۔

ذاکر صاحب موجود ہوتے تو اُن کی تقریر کی بات ہی کچھ اور ہوتی۔ مرزا محمود بیگ صاحب نے اپنے انداز بیان کے جوہر دکھائے مگر وہ ساحری کہاں سے لاتے جس کے سامنے مشکل سے کسی کا چراغ جل سکتا ہے۔ جنرل شاہ نواز نے نیتاجی کے ظفر کی قبر پر جانے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کا عہد کرنے کا قصہ سنایا۔ بیگم اختر نے ظفر کی غزل جس دلسوزی سے گائی، اُسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ موسیقی میں غزل کے پورے حسن کو ادا کرنے کے لئے شاعری سے مس ضروری ہے۔ اس کے بعد اوشا سیٹھ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور آخر میں برجو مہاراج اور اُن کے ساتھیوں نے کتھک رقص کا ایک نادر نمونہ پیش کیا۔ کتھک سر تا پا شاعری ہے اور اس موقع پر یہ شاعری تو بہت سے دلوں کو تڑپا گئی۔

جو لوگ اس اجتماع میں موجود تھے اُنھوں نے اس موقع پر روح میں ایک ایسی بالیدگی، جذبات میں ایک ایسی آنچ اور ذہن میں ایک ایسی رفعت محسوس کی، جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اپنے پیارے وطن ہندوستان کی خدمت کا جو ولولہ اس یادگار اجتماع سے بیدار ہوا وہ جوہری توانائی کی طرح مدتوں تعمیر و تشکیل کے نقش اُبھارتا رہے گا۔

آٹھ بجے شب کے قریب یہ روح پرور نشست ختم ہوئی۔ ساڑھے نو بجے شب مشاعرہ شروع ہوا۔ اُس کی داستان دوسری قسط میں دیکھئے۔

(باقی)

قمر رئیس

روس میں ادبی سیاحت

مکرمی و مخدومی سرور صاحب۔

بڑی ندامت ہے کہ آپ کے نوازش نامے کا جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ دراصل گزشتہ جون میں جب آپ کا مکتوب ملا تو اس کے بعد ہی یونیورسٹی میں تعطیلات ہوگئیں۔ اور میں سوویت یونین کی سیاحت پر نکل پڑا تقریباً ایک ماہ تک بعض قابلِ دید مقامات اور شہروں کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ اسی دوران ماسکو میں ہندوستانی نمائش کے افتتاح کے موقع پر فیض صاحب اور ظ انصاری سے ملاقات ہوئی۔ ہم تینوں نمائش کے ہنگامے سے نکل کر ایک کیفے میں بیٹھ گئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک اردو شاعری کے حال اور مستقبل پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ عالمِ بے زبانی میں ہم زبانوں اور ہم مشربوں کی یہ نشست بڑی غنیمت تھی۔ اس کے دوسرے ہی روز میں لینن گراڈ روانہ ہوگیا بعد میں ۲۰ر اگست سے ۲۰ر ستمبر تک بحرِ اسود کے قریب قفقاز کی ایک صحت گاہ میں آرام کرتا رہا اور زیرِ علاج رہا۔

میری یہ سیاحت بڑی حد تک ادبی سیاحت تھی۔ یعنی جہاں بھی گیا میں نے کوشش کی کہ سب سے پہلے روس کے مشاہیرِ ادب کی یادگاریں دیکھوں۔ اس کے بعد اگر وقت مل سکا تو آرٹ گیلریاں، عجائب گھر اور دوسرے تہذیبی ادارے دیکھے۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے اپنی سوویت یونین کی مختصر سیاحت کے دوران کن علاقوں کی سیر کی اور کیا دیکھا۔ لیکن اس ملک میں مشاہیرِ فن و ادب کی زندگی اور کارناموں سے متعلق نادرات اور آثار کو جس احترام، اہتمام اور حسنِ انتظام کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے اسے دیکھ کر کم از کم میں حیرت زدہ رہ گیا۔

لینن گراڈ میں پشکن اور گوگول کے شاندار عجائب گھروں سے قطع نظر دریائے نیوا کے کنارے ایک خوبصورت کشادہ عمارت ہے جسے "ادبی میوزیم" کا نام دیا گیا ہے۔ اس عمارت کے آٹھ ہالوں میں سے ہر ہال ایک ادیب کے لئے وقف ہے۔ یہاں گوگول، ٹالسٹائی، پشکن، ترگنیف، دوستوفسکی، لیرمانتوف، گورکی اور مایاکوفسکی کو گویا زندہ کر دیا گیا ہے۔ ان کے مسودات، مکاتیب، انکی تصانیف کے نادر ایڈیشن، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم، ان کی تصویریں اور مجسمے، ان کے کامیاب کرداروں کے اسکیچ اور روغنی تصویریں، ان کے اعزّا اور انکی محبوباؤں کی تصاویر، ان کو دئے گئے تحائف الغرض وہ سب کچھ ملتا ہے جو ان کی زندگی کے بارے میں دستیاب ہو سکا ہے۔ ماسکو میں ممتاز مشاہیرِ ادب کے الگ الگ میوزیم ہیں۔ میں نے وہاں ٹالسٹائی، گورکی، پشکن، دوستوفسکی اور مایاکوفسکی کے میوزیم دیکھے۔ ہر میوزیم کی عمارت کئی منزلوں اور متعدد ہالوں پر مشتمل ہے۔ ان ہالوں میں ان کی زندگی شخصیت اور تصانیف سے متعلق بے شمار نادرات ایسی نفاست اور حسن کارانہ ڈھنگ سے آراستہ کئے گئے ہیں کہ دیکھ کر روح وجد کرنے لگتی ہے۔ صرف یہی نہیں ان میں سے بیشتر ادبی عجائب گھروں میں لکچر ہال بھی ہیں۔ جہاں ہفتہ میں دو دن یا تین دن اس ادیب کے فکر و فن پر، اس کے معاصرین پر یا اس کے عہد کے ادبی رجحانات پر خصوصی لکچر ہوتے ہیں اور لوگ ذوق و شوق سے سُنتے ہیں۔ پشکن میوزیم کے سامنے، دیوار کے سایہ میں بیٹھی ہوئی مجھے دو اِستانیاں ملیں جو کسی دور افتادہ گاؤں سے پشکن پر لکچر سُننے آئی تھیں۔ خیر اس کی تفصیل پھر کسی موقع پر لکھوں گا۔ لیکن یقین جانئے ان بے مثل یادگاروں کو دیکھتے ہوئے میں ہمیشہ ایک حسرت ناک خواب دیکھتا رہا۔ کاش ہمارے ملک میں بھی ہمارے مشاہیر کی ایسی ہی پُرشکوہ یادگاریں تعمیر ہوں۔ حال ہی میں ہماری زبان میں گوشۂ جگر کے قیام کی خبر پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ فی الحال اگر ہمارے مشاہیر کے الگ الگ میوزیم قایم نہ ہو سکیں تو جامعہ کی علم افروز سرزمین پر کاش یہ گوشہ ہی اتنا وسیع ہو جائے کہ اس میں میر و غالب سے لے کر پریم چند اور مجاز تک سما سکیں۔ اور یہ گوشۂ جگر "ایوانِ ادب" بن جائے۔ دہلی میں انجمن کی مجوزہ عمارت میں بھی اس کے لئے گنجایش نکل سکتی ہے۔

سوویت یونین میں نہ صرف بڑے بڑے شہروں میں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی اس طرح کی بے شمار یادگاریں ہیں۔ مثلاً قفقاز کے شہر پتی گورسک میں روسی زبان کے عظیم رومانی شاعر لیرمنتوف کے دو میوزیم ہیں۔ ایک وہ مکان جس میں اس نے چند سال گزارے اور ایک وہ مکان جس میں ایک دعوت کے موقع پر اس بذلہ سنج شاعر کے مذاق کا بُرا مان کر ایک فوجی افسر نے اسے ڈوئل کے لئے چیلنج کیا اور ۲۷ سال کی عمر میں اسے ہلاک کر دیا۔ اس ڈوئل میں جہاں وہ قتل ہوا وہاں بھی ایک خوبصورت یادگار تعمیر کی گئی ہے لیرمنتوف نے یہاں مشوق نام کی پہاڑی پر جس جگہ

بیٹھ کر اپنی بہترین نظمیں لکھی تھیں وہاں بھی سات مرمریں ستونوں پر ایک نیلے گنبد کی صورت میں بڑی دل فریب یادگار تعمیر کی گئی ہے جسے عارضہ کہتے ہیں، جہاں وہ چند ماہ کے لئے دفن کیا گیا وہاں بھی ایک سنگین یادگار ہے۔ اس کے علاوہ اس چھوٹے سے شہر کی ایک شاہراہ ایک صحت گاہ اور ایک تعلیم گاہ بھی اس جواں مرگ شاعر کے نام سے منسوب ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ سوویت یونین میں ماضی کے تہذیبی ورثے اور ادبی آثار کو محفوظ رکھنے پر کیسی توجہ دی جاتی ہے اور فنی و ثقافتی اہمیت کے اداروں اور یادگاروں کی سرپرستی و تعمیر پر کیسی فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

سرور صاحب! پچھلے عریضے میں میں نے سوویت یونین میں اردو کی مقبولیت کا ذکر کیا تھا۔ چاہتا ہوں کہ اس کا دوسرا رُخ بھی آپ کو دکھا دوں۔ بے شک ایک زمانے تک اس ملک میں اُردو ہند و پاک کی مقبول ترین زبان رہی۔ لیکن گزشتہ پندرہ بیس سال میں یہاں کے مختلف تہذیبی، تعلیمی اور اشاعتی شعبوں میں اُردو کی جو بساط بچھی تھی وہ اب سمٹتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ہندوستان کی دوسری زبانیں لے رہی ہیں۔ اس کا سبب بڑی حد تک خود ہماری بے اعتنائی اور بے نیازی ہے۔ سوویت اشاعت گھروں سے اُردو میں جو رسائل نکلتے اور جو کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں انھیں خرید کر پڑھنا گویا کفر ہے۔ بعض حضرات پروپیگنڈے کی بات کریں گے۔ میں کہوں گا کیا ٹالسٹائی پشکن اور ترگنیف جیسے ادیبوں کی ادبی تصانیف میں بھی کسی ازم کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے؟ اور پھر سوشلزم کا نعرہ لگا کر اس کے یا اس کے کارناموں کے پرچار سے ڈرنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے برعکس ہندی میں شائع ہونے والی کتابیں کثرت سے پڑھی جاتی ہیں۔

تاشقند ریڈیو اسٹیشن سے گزشتہ ۶ سال کے عرصے سے اُردو کی دو مجلسیں نشر ہوتی ہیں۔ ان مجلسوں میں خبروں اور تبصروں کے ساتھ ساتھ گاہے گاہے فیچر اور ڈرامے بھی ہوتے ہیں۔ ازبکستان کے ادیبوں اور یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں رپورتاژ اور مضامین بھی ہوتے ہیں۔ اُردو شعبے کے کارکنوں کا عملہ آٹھ افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں اُردو کے ایک پرستار حیدر ریلدوش یا تیف کی دل فریب اور دلچسپ شخصیت بھی ہے۔ جنھیں پچھلے ہفتے وزیر صحت سوشیلا نیئر نے "چھپے رستم" کا خطاب دیا ہے۔ ان کے علاوہ دو روسی خواتین ریتا اور گالیہ اور ایک تاتاری خاتون رئیسہ بھی ہیں۔ یہ تمام افراد اُردو پروگراموں کو دلچسپ اور بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کتنے اُردو داں حضرات یہ پروگرام سنتے ہیں؟ اس کا اندازہ مذکورہ ادارہ ان خطوں سے کرتا ہے جو اُردو نشریات کے بارے میں موصول ہوتے ہیں۔ اور سال بھر میں آنے والے ایسے خطوط کی گنتی ایک ہاتھ کے پوروں پر کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف تاشقند ریڈیو نے گزشتہ دس ماہ سے ہندی کی ایک مجلس شروع کی ہے اور مجھے وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ ہندی پروگراموں کے خطوں کا تانتا سا بندھا ہوا ہے۔ بے شک یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ہم وطن کثرت اور توجہ کے ساتھ ہندی پروگرام سنتے ہیں لیکن ہم کس طرح کہیں کہ ہندوستان میں اُردو کو مادری زبان کہنے والے بھی کم نہیں۔

ہماری اس بے نیازی کے زیر اثر اگر ہوا کا رُخ بدل رہا ہے تو ایسی تعجب کی بات نہیں۔ اب سوویت ماہرین ہندی، بنگلہ، تلنگو، تامل اور پنجابی ہی کو ہندوستان کی عوامی اور بنیادی زبانیں مانتے ہیں۔ لیکن میں آپ کی رجائیت کی زبان میں یہ کہوں گا کہ حالات سے مایوس ہونے کے بجائے ہمیں ان کو حقیقت پسندانہ ڈھنگ سے سمجھنا اور ان کو صحیح رُخ دینا ہے میں ایسی ہی کر رہا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ ہماری زبان کے قارئین بھی اس طرف توجہ دیں۔ انھیں صرف یہ دکھانا ہے کہ وہ سوویت یونین میں اُردو کی توسیع و اشاعت کی قدر کرتے ہیں۔ اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اُردو ہندوستان کی ایک زندہ عوامی زبان ہے۔

ازبکستان کے مختلف شہروں کے اسکولوں میں بچوں کو ہندی اور اُردو بھی پڑھائی جا رہی ہے۔ اور اب چند اسکولوں میں ہندی اور اُردو کو بعض مضامین کا ذریعۂ تعلیم بھی بنایا جا رہا ہے۔ تاکہ اسکولوں کی تعلیم ختم کر کے طلبہ ان زبانوں میں ایسی مہارت پیدا کر لیں اور یونی ورسٹی کی سطح پر زبان کی تعلیم کی ضرورت نہ رہے۔ اس سلسلے میں اُردو اور ہندی میں درسی کتابیں بھی ترتیب دی جا رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بھی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ تاجکستان میں یولا تودہ صاحب نے غالب کے خطوط پر اور غفاروو صاحب نے غالب کی فارسی شاعری پر کینڈیڈیٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ یہ ڈگری کم و بیش ہماری ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے برابر ہے۔ (باقی صفحہ ۹ پر)

اسرار اکبر آبادی

چاند اور چراغ کی کہانی

(دیوالی کے موقع پر)

تاروں کے ساگر میں چندا ڈھونڈ رہا تھا سیپ
دنیا کی تاریک فضا میں روشن تھا اک دیپ
دیپک نے چندا کو پکارا
"اے میرے دلدار
آجاؤ اک بار اُتر کر، کر لیں ہم تم پیار
سوئی دھرتی کو پہنا دیں چاندی کا اک ہار
کلیاں جاگیں، غنچے جاگیں، جاگ اٹھے گلزار
دل میں شوخی لے کر جاگے پھولوں کی مہکار
آجاؤ اک بار اُتر کر،
کر لیں ہم تم پیار"
اتنا سن کر جاگے مچلے چندا کے جذبات
"میں آؤں گا پاس تمہارے دیوالی کی رات
نغموں کی بارات سجا کر ناچیں گے ہم ساتھ
دھرتی اور امبر کی چھپ کر ہو جائے گی بات
انگ انگ میں مستی بھر کر گائیں گے لمحات
دیوالی کی رات فلک سے
میں آؤں گا پاس"

دیوالی کی رات سجی اور مہکے دل کے پھول
گلزاروں پر جھوم کے چھائی رنگ رنگیلی دھول
گھر کی اونچی دیواروں پر اجلا اجلا روپ
ہر آنگن میں پھیل گئی تھی ساون کی سی دھوپ
گلیوں میں اُڑتے پھرتے تھے نیلے پیلے رنگ
کیف کی لہریں گھوم رہی تھیں آوازوں کے سنگ
بازاروں میں ہنستے چہرے جیسے شوخ بہار
ہونٹوں کی کھلتی کلیوں پہ گرتی رم جھم پھوار
مست فضا میں ناچ رہی تھی پائل کی جھنکار
گونج اٹھا استفسار۔

دیپ نے اپنے رنگ محل سے دیکھا جگ سے دور
تاروں نے سمجھایا "چندا آنے سے مجبور
آنے سے مجبور ہے چندا
آنے سے مجبور۔"

ادبی مجلس۔ (نئی دہلی)

ادبی مجلس (نئی دہلی) نے تامل کے مشہور ادیب پورنم راما چندرن اوما چندرن کے اعزاز میں گزشتہ ماہ ایک نشست منعقد کی جس میں شری اوما چندرن نے تامل ادب کے چند جدید پہلوؤں پر بے تکلف بات چیت کی۔ شری اوما چندرن دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی طرف سے چند روز کے لئے دہلی آئے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ آج کے تامل ادب میں افسانہ اور ناول سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ افسانوں میں سے قریب ۸۰ فی صدی کا موضوع محبت ہوتا ہے اور باقی ۲۰ فیصد میں نفسیات۔ نئے تجربے اور ادیبوں کا انفرادی اسلوب ملتا ہے۔ ناولوں میں زیادہ تر پرانے اور نئے تاریخی موضوع لئے جاتے ہیں۔ اب سماجی اور نئے موضوع بھی آزمائے جا رہے ہیں۔ طویل مختصر افسانے بھی فروغ پا رہے ہیں۔ محبت کے موضوعات میں شمالی ہند کی داستانیں بھی اپنائی گئی ہیں۔ چنانچہ نور جہاں اور جہانگیر اور ممتاز محل اور شاہ جہاں کی محبت پر کئی ادیبوں نے لکھا ہے۔ ترجموں کے باب میں اردو ادیب پریم چند اور بنگالی کے ادیب سرت چندر، بنکم چندر اور ٹیگور کی کئی تصنیفات کے ترجمے خوب مقبول ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد کے زمانے سے ملک کی دوسری زبانوں بالخصوص ہندی کے ادب میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

شری اوما چندرن نے کہا کہ جہاں جنوبی ہند میں شمالی ہند کی تہذیب اور زندگی کے بارے میں کھوج اور دلچسپی بڑھ رہی ہے وہاں شمالی ہند میں جنوبی ہند کے بارے میں ایسی دلچسپی قدرے کم نظر آتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ تامل ادب کے نئے روپ اور قومی زندگی میں تحریک آزادی کو بہت دخل رہا ہے۔ سبرامنیہ بھارتی نے جو جدید تامل شاعری کے جنم داتا ہیں ۱۹۱۰ء میں مہاتما گاندھی پر ایک نظم لکھی۔ ان کی شاعری حب الوطنی اور وحدت کے جذبات سے بھری ہوئی ہے۔ بندے ماترم اور جن گن من کے قومی ترانوں کا تامل میں منظوم ترجمہ بھی انھوں نے ہی کیا۔

تامل کے جدید نثری ادب کی نشوونما میں آر۔ کرشنا مورتی "کلکی" کا نام سرفہرست ہے۔ وہ تامل کے موجودہ تاریخی ناول کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ جو ہفت روزہ "کلکی" شروع کیا جو آج سوا لاکھ کے قریب چھپتا ہے۔

شری اوما چندرن نے بتایا کہ تامل ادیبوں میں ڈرامہ زیادہ مقبول نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ ادب روایت پرست ہے۔ اس پر ابھی تک مغربی ادب کی سوشلزم اور وجودیت کا سایہ نہیں پڑا۔

نشست کے صدر جناب علی جواد زیدی نے ادبی مجلس کے پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی مختلف زبانوں کو ادبی جانداری کو فروغ دینے کی مساعی بہت مبارک ہیں۔ آج ہمیں اپنے گھر اور اپنے مختلف حصوں کی زندگی کے بارے میں اچھی واقفیت ہونی چاہیئے۔ ایسا ہونے سے ہی ہمارے ادب میں وہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگی جو اسکی انفرادیت اور عظمت کے لئے ضروری ہے۔

مراسلات

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

علامہ اقبالؒ کی مندرجۂ بالا مشہور غزل بانگ درا حصۂ اول کے آخر میں درج ہے (ص ۱۶۲)۔ یہ غزل سب سے پہلے اردو کے دو رسائل مخزن اور فصیح الملک میں بیک وقت ماہ مئی ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی اور دونوں رسائل میں اشعار کی تعداد چودہ چودہ ہے مگر بانگ درا میں حذف و اصلاح کے بعد صرف بارہ اشعار رہ گئے ہیں۔ دو شعر جو بانگ درا میں حذف ہو گئے ہیں درج ذیل ہیں:-

بیٹا ہو دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ　　یہ انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

ہاں اے شراب عشق یہ دن ہیں نمو کے　　ایسی اچھل کہ خلوت مینا بھی چھوڑ دے

بانگ درا کی ترتیب کے وقت علامہ نے تین اشعار میں اصلاح بھی فرمائی ہے:-

نقش اول (اصل)	نقش ثانی (اصلاح شدہ)
۱۔ واعظ! کمال ترک سے یاں ملتی ہے نجات	واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے	....
۲۔ لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں زخم عشق	لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
بسمل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے	....
۳۔ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے!	....
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے	اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

یہ غزل کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی میں بھی درج ہے (ص ۲۰)، مگر مقطع ندارد ہے۔ دونوں حذف شدہ اشعار سرود رفتہ کے (ص ۱۶۰) میں درج ہیں۔ (محمد بشیر الحق دسنوی)

"توارد"

آپ کے پرچے میں "توارد" پر مضمون دیکھا میں تو اسے صریح سرقہ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ جب کبھی ایسی کوئی چیز سامنے آجائے اس کی بذریعہ اخبارات تشہیر کی جائے۔ بہت عرصہ ہوا بمبئی میں ایک مشاعرے میں کسی نوجوان شاعر نے بڑی معرکہ کی غزل پڑھی۔ اس مجمع میں ایک صاحب نے کھڑے ہو کر انھیں ٹوکا اور کہا کہ یہ غزل فلاں صاحب کی ہے اور چند سال پیشتر فلاں رسالے میں بھی نکل چکی ہے۔ یہ صاحب بھی گرگ باراں دیدہ تھے۔ کہنے لگے کہ "مشاعرہ ایسی جگہ نہیں ہے جہاں اس طرح سے مخالفت کی جائے یا بحث و مباحثہ کیا جائے، آپ کسی اخبار میں مضمون لکھئے، میں اس کا جواب دوں گا۔" اس بحث کے بعد لوگوں کے اصرار کے باوجود انھوں نے بقیہ اشعار سنانے سے انکار کر دیا۔

(ضیاء الدین احمد برنی)

یہ شعر کس کا ہے؟

۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کے 'ہماری زبان' میں جناب نثار احمد فاروقی صاحب نے مندرجہ ذیل شعر کے مصنف کے بارے میں دریافت فرمایا ہے:

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

یہ "ملا فرج اللہ شوستری - فرجؔ" کا ہے۔

(سید نعیم الدین)

مشورے

محمد صدیق صاحب کا مشورہ (ہماری زبان ۸ر اکتوبر ۶۳ء) کہ انجمن کا انگریزی آرگن بھی ہو، نہایت مفید اور اہم مشورہ ہے۔ اراکین انجمن کو اس پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ انگریزی آرگن کے بغیر ہماری آواز ان مقامات تک نہیں پہنچ پائے گی جہاں اس کو پہنچنا چاہئے۔

(مدثر حسین رضوی)

صحیح کیا ہے؟

'ہماری زبان' کے ۸ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کے پرچے میں پروفیسر یوسف بلخی کا نقل کیا ہوا کسی نامعلوم شاعر کا تخلیق کردہ شعر پڑھا۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

رسالہ شاہراہ دہلی کے سالنامہ ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۴۵ پر اردو کے مشہور شاعر جناب نریش کمار شادؔ صاحب اپنے ایک مضمون میں متذکرہ بالا شعر کو اس طرح نقل کرتے ہیں۔ ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

دونوں حضرات نے اس شعر کو ایک لفظ کے فرق سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے 'انداز' اور شادؔ صاحب نے 'آثار' کا لفظ لکھا ہے۔ آخر یہ فرق کیوں؟

کیا کوئی صاحب اسم شاعر بتانے سے پہلے اس شعر کا اصلی روپ ناظرین "ہماری زبان" کے لئے پیش کرنے کی کوشش کریں گے؟

(دلجیت سنگھ ولد بابو دلیپ سنگھ فائقؔ)

نوٹ: آثار صحیح ہے۔ ادارہ

نصیر الدین ہاشمی

جامعہ نظامیہ کے چند قدیم مطبوعہ اُردو دیوان

جامعہ نظامیہ کا تعارف اس سے پہلے "ہماری زبان" کے صفحات پر ایک مرتبہ ہو چکا ہے۔ یہاں قلمی اور مطبوعہ عربی، فارسی اور اُردو کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اس میں سے تقریباً (۱۳۰۰) قلمی۔ اور تقریباً سات ہزار مطبوعات ہیں۔ اُردو مخطوطات کی تعداد (۱۴۵) ہے اور اُردو مطبوعات تین ہزار سے زیادہ ہیں مگر مطبوعات کی صحیح تعداد ہنوز ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کے اُردو مخطوطات کا تذکرہ رسالہ "نوائے ادب" بمبئی میں شایع ہو رہا ہے۔ یہاں چند اُردو مطبوعہ دیوان کا تعارف کرایا جاتا ہے جو قدیم کہے جاسکتے ہیں۔ امید ہے کہ اصحاب علم کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

(۱) کلیات میر تقی میر:-

یہ کلیات (۱۲×۹) سائز کے (۱۰۸۵) صفحات پر مشتمل ہے اور ٹائپ میں طبع ہوا ہے۔ طباعت سنہ ۱۸۱۱ء مطابق سنہ ۱۲۲۶ھ ہے۔ کلیات کے پہلے صفحہ کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

"کلیات میر تقی مدرسہ عالیہ کے لئے نوازش و تفضلات سے صاحبان عالی شان کالج کونسل کے عہدۂ حکومت میں زبدہ نو ـــــ عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے حسب الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی دام اقبال اور اعانت و پرورش سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ اور عنایت و کرم سے کپتان گالر صاحب دام ثروتہ اور مرحمت و امداد سے کپتان ٹامس روبک صاحب دام اقبال کی تصحیح مرزا کاظم علی جوان اور مرزا جان طپش۔ مولوی محمد اسلم و قار نیجر مسٹر ڈ منشی غلام اکبر سنہ ۱۸۱۱ء میں مطابق سنہ ۱۲۲۶ھ ہندوستانی چھاپہ خانہ میں چھاپہ کیا ہوا منشی مار بخش کا"

آخر پر فہرست بھی شامل ہے اور تصحیح اغلاط کے کئی صفحے ہیں۔

یہ کتاب جامعہ نظامیہ کے اُردو ذخیرہ مطبوعات کی قدیم ترین کتاب ہے۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبہ جامعہ عثمانیہ نے اس کلیات کا ایک نسخہ امریکہ میں ملاحظہ کیا تھا مجھے اس کا کوئی اور نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہوا۔

(۲) کلیات آتش:-

خواجہ حیدر علی آتش کا کلیات (۱۱×۶) سائز کے (۲۹۲) صفحات کارخانہ علی بخش خاں میں طبع ہوا ہے۔ متن کے علاوہ حاشیہ پر بھی کلام درج ہے سنہ ۱۲۶۹ھ میں اس کی طباعت ہوئی ہے۔ منشی ویشرف علی بخش نے تاریخ طباعت نکالی ہے۔ تاریخ وفات آتش جو سنہ ۱۲۶۳ ہجری۔ منشی مظفر علی اسیر اور منشی اشرف علی اشرف نے نکالی ہے۔ یہ دونوں تاریخ اس میں درج ہیں۔

(۳) گلدستہ عشق معروف دیوان رند:-

سید محمد خان رند کا دیوان ہے جو سنہ ۱۲۶۹ ہجری میں مطبع مصطفائی میں طبع ہوا ہے۔ دیوان (۱۰×۶) سائز کے (۲۱۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ متن کے علاوہ حاشیہ پر بھی کلام ہے۔ اشرف علی نے طباعت کی تاریخ نکالی ہے۔

(۴) دفتر فصاحت:-

خواجہ محمد وزیر کا دیوان ہے۔ مطبع مصطفائی میں سنہ ۱۲۷۴ ہجری میں طبع ہوا ہے۔ سید ہادی علی کا دیباچہ لکھا ہوا ہے کئی قطعات تاریخ مرتب دیوان کے درج ہیں۔ دیوان (۱۰×۶) سائز کے (۲۵۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر پر طبع دیوان کی بھی کئی تاریخیں مختلف اصحاب کی درج ہیں۔

(۵) دیوان درد:-

(۱۰×۶) سائز کے (۴۸) صفحے پر ہے۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں طبع ہوا ہے۔ کوئی کلاں محمدی مطبع میں چھپا ہے۔ آخر میں تذکرہ میر حسن علی سے ایک صفحہ مصنف کے حالات بھی درج ہیں۔

(۶) کلیات برق:-

(۱۲×۸) سائز کے (۶۶۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع کا نام درج نہیں ہے۔ طباعت سنہ ۱۲۶۹ھ میں ہوئی ہے۔ پہلے صفحہ پر جو مونوگرام (طغرا) ہے وہ واجد علی شاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ کے سرکاری مطبع میں اس کلیات کی طباعت ہوئی ہے۔

آغاز

ہر نقش پا ہے گردہ رُخ آفتاب کا ذرہ ہوں میں غبار در بوتراب کا

(۷) دیوان عرش:-

یہ میر تقی میر کے فرزند سید عسکری عرف کلو کا دیوان ہے جو اخبار "کارنامہ" میں ہفتہ وار شائع ہونے کے بعد مجلد کیا گیا ہے۔ آغاز (۴) صفحے نہیں ہیں گویا ناقص الاول ہے۔ اخبار مذکور کی جلد (۱) نمبر (۳۹) سے اس دیوان کی طباعت ۱۸۷۴ء سے شروع ہوئی ہے اور ۱۸۷۵ء میں مکمل دیوان طبع ہو گیا۔ شیخ محمد خاں نے جو خود کو عرش کا شاگرد رشید بتاتا ہے اس دیوان کو مرتب کیا ہے۔

دیوان میں (۳۱۶) غزل، ایک واسوخت اور حمد میں ایک فارسی قصیدہ ہے۔ دیوان کے حاشیہ میں

ایک عبارت درج ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ عرش نے زبان کی کیا کیا اصلاح کی ہے چنانچہ کسی قدر اقتباس پیش ہے۔

"بہت سارے الفاظ ۱۱۴۸ھ میں حاتم دہلوی نے زبان مروجہ کے عیوب ظاہر کئے اور الفاظ غلط و ثقیل نظم کلام سے خارج کئے اور جو روزمرہ عام فہم و خاص پسند تھا اس کو اختیار کیا ۔۔۔ مگر جناب میر کلو صاحب عرش فرزند جناب میر تقی میر نے اپنے کلام کو جملہ عیوب سے پاک رکھا اور جس لفظ کو خلاف محاورہ فصحا حال دیکھا اس کو ترک کیا بلکہ عیوب مرقومہ بالا کے علاوہ عروض میں سوائے حرف الف مضا عفی یائے ہندی کا گرنا معیوب جانا اور قوافی میں خالوں، تو ابوں، انگاروں یاروں، جانوں، پروانوں کا لانا عیب تصور کیا کہیں قافیہ ہندی کے ساتھ فارسی کا لفظ استعمال نہ کیا۔ ارباب نظر دیکھیں گے کہ کلام حضرت عرش عیوب سے مبرا الفاظ ثقیل سے خالی ہے "

چند شعر عرش کے ملاحظہ ہوں :-

دیکھ کر سوزش کو حیرت سے ہوا جراح سرد
داغ پر کافور جب کا مرہم ہوا

طینت میں مرے ہے خاکساری   مٹی سے خمیر ہے بشر کا

دم بہ دم اللہ رے یادِ بتانِ سنگدل
رشتۂ جاں تارِ زنارِ برہمن ہو گیا

دنیا میں آ کے عشق کے صدمے دکھاتی ہے
اس روح کو عدم سے تھی پیکر کی احتیاج

اعجاز سوز عشق سے بزم شراب میں   مانند مرغ جان پڑی ہر کباب میں

گلشن عالم میں کیوں ہے باغباں کو مجھ سے خار
گل نہیں بلبل نہیں خنداں نہیں نالاں نہیں

خدا کرے وہ صنم مان لے پیام وصال
ہمیشہ عرش سوال و جواب رہتا ہے

(۸) دیوان دوم اسیر :-

یہ دیوان ۱۲۸۱ھ ہجری مطبع علوی علی بخش خاں میں طبع ہوا ہے۔ سائز (۱۱ × ۷) ہے (۵۳۰) صفحے پر مشتمل ہے۔ آخر میں چار صفحے پر صحت نامہ بھی شامل ہے۔

(۹) دیوان موجد :-

یہ شیخ قادر علی موجد شاگرد وزیر کا دیوان ہے۔ اخبار "کارنامہ" میں ہفتہ وار طبع ہوا ہے۔ (۱۳۱) صفحے ہیں۔ سائز (۱۲ × ۸) ہر صفحہ میں دو کالم ہیں۔

آغاز یہ ہے :-

کیا عاصیوں کو خوف ہو نارِ جحیم کا
بحر کرم ہے جوش پہ میرے کریم کا

غزلیات ردیف وار ہیں مگر صرف چند ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ دیوان کے آخر میں لبریز کی طرف سے ایک نوٹ بھی طبع دیوان کا درج ہے۔ دیوان کی طباعت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی ہے۔

(۱۰) اخبار کارنامہ کے چند صفحات میں چند شعرا کے منظوم خطوط بھی ہیں جن میں حسب ذیل شعرا کے خطوط شامل ہیں :-

(۱) جرأت (۲) سعادت یار خاں رنگین (۳) میاں نور الاسلام منظر (۴) محمد حسن عرف اچھے صاحب جوش تخلص (۵) مرزا خاں نوازش (۶) سید مقصود عالم رضوی (۷) سعادت خاں ناصر (۸) میر حیدر حسین حیدر۔ یہ تمام خطوط عشقیہ ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین کے خطوط سے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

بھول مت جائیو مجھے یکسر   دیکھے برسوں کی دوستی پہ نظر
ہاتھ میں میرے دل کو لے کے یوں   اب یہ کرتے ہے بے وفائی کیوں
جو نہ منظور تھا نباہ تمہیں   تو نہ کرنی تھی پھر یہ چاہ تمہیں
تم جو کر بیٹھے اگی ہو مجھ سے کجی   مجھ کو سودا سا ہو گیا ہے جی
بسکہ رہتی تھی آپ کی مجھے یاد   دل تصور ہی سے رہے ہے شاد
پہروں ہوتی ہے آنکھیں رستا ہوں   اور تصور سے میں یہ کہتا ہوں

دل سے رنگین کو کیوں گئے تم بھول
کیا یہی دنیا کا ہے یہی معمول

اور کئی شعر ہیں۔

محمد حسن خاں عرف اچھے صاحب متخلص بہ جوش کے مکتوب کے چند شعر۔

قاصدا تو ہی جان عاشق ہے   قاصدا تو ہی وحی ناطق ہے
قاصدا تو مرا پیمبر ہے   کوئے جاناں کا تو ہی رہبر ہے
قاصدا تو مرا مسیحا ہے   راحت جان ناشکیبا ہے

عشق کے درد کی دوا تو ہے
مرض ہجر کی شفا تو ہے

(۱۱) فغاں دہلی۔ مطبع چشمۂ فیض دہلی میں ۱۲۹۹ھ ہجری میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ کل (۲۴۶) صفحے ہیں۔ ناقص الآخر ہے متن اور حاشیہ دونوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ سب سے پہلے ظفر کی غزل ہے جس کا مطلع

مقدور کس کو حمد خدائے جلیل کا   اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا

میر مہدی مجروح حسامی کی غزلیات۔ اس کے بعد شہر آشوب ہیں جس میں کنور بشن پرشاد فرحت تخلیق، شہر آشوب مرزا رفیع سودا، صدر الدین خاں آزردہ، مصطفی خاں شیفتہ، شیخ ابراہیم ذوق، نواب مرزا یعنی داغ، قربان علی بیگ سالک۔ اس کے علاوہ باقر علی خاں کامل فرزند زین العابدین خاں عارف کا شہر آشوب شامل ہے۔ ان کو قربان علی بیگ سالک کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور اصحاب کے

شہر آشوب موجود ہیں۔ افسوس ہے ناقص الآخر ہوئے۔ دیگر شعرا کے شہر آشوب شامل نہیں ہیں۔

آخر شہر آشوب جس کا صرف عنوان لکھا گیا ہے غلام حسین خاں صاحب عرف نواب خانی متخلص بہ عاصی خلف نواب خادم حسین خاں بہادر مغفور نبیرۂ نواب افراسیاب خاں کا نام ہے۔ مگر ان کا شہر آشوب شامل نہیں ہے۔ نہیں معلوم ان کے بعد اور کس کس کے شہر آشوب تھے۔

باقر علی خاں کامل فرزند زین العابدین خاں عارف کے شہر آشوب کے چند بند پیش ہیں:-

---

تمام گلشن عیش و سرور تھی دہلی　　تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلع خورشید نور تھی دہلی　　تمام غیرت صد کوہ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکان عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہان عیش

ملک صفات تھا یہاں کا ہر ایک فرد بشر　　بڑا بھی یہاں کے زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوق خاص دنیا پر　　یہاں کے تمام سے یکتا تھا مس بھی زر گر
یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں　　جو روز عیش میں گزرا تو شب مسرت میں
پڑی ہوئی ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں　　پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادی کہاں اور وہ بادشاہ کہاں
رہا جو کوئی تو وہ مرتبہ وہ جاہ کہاں

اور طویل شہر آشوب ہے۔

اس تفصیل سے جامعہ نظامیہ کے اردو مطبوعہ چند دواوین کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اردو نظم میں کتابوں کی تعداد (۱۸۲) ہے۔ صرف گیارہ کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

بقیہ ۱۲: روس میں ادبی سیاحت

اس کے علاوہ گلیبو و صاحب فیض پر اور کیپر اسکنس صاحب راجندر سنگھ بیدی پر کام کر رہے ہیں۔ تاشقند میں میرے ایک رفیق تش میرزا الف بھی ایک عرصے سے بیدی پر کام کر رہے ہیں اور حال ہی میں انھوں نے ازبکی زبان میں بیدی کی کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ یونی ورسٹی میں اردو کورس کے پانچویں سال میں طلبہ کو ایک مقالہ لکھنا ہوتا ہے۔ ایک استاد مقالے کا نگراں اور حامی ہوتا ہے اور ایک مخالف شعبہ کے ایک باضابطہ جلسے میں مقالہ پڑھا جاتا ہے۔ مخالف اس پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقالہ نگار اور حامی اس کا جواب دیتے ہیں۔ اسی جلسے میں اس مقالے پر نمبر دیے جاتے ہیں۔ اس سال حسب ذیل موضوعات پر مقالے لکھے گئے۔

۱۔ جناب غفور۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز و ارتقا۔
۲۔ جناب منور۔ نظیر کے کلام میں اس عہد کی سماجی اور اقتصادی زندگی۔
۳۔ مس سوار۔ احمد عباس کی حقیقت نگاری
۴۔ جناب صورت۔ غلام ربانی تاباں کا فن
۵۔ جناب حاتم۔ مجاز۔ حیات اور فن

آئندہ خط میں ازبکستان کے کتب خانوں اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ کروں گا۔ امید ہے کہ آپکی صحت اچھی ہو گی۔

دفتر اور شعبہ اردو میں جملہ پرسان حال کو آداب کہیے گا۔

نیاز مند۔ قمر رئیس

دو دربھ رائٹرس کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام

گزشتہ مہینے اردو مصنفین کا ایک جلسہ انجمن اتحاد باہمی کی تشکیل کے لئے نواب عبدالوحید غازی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ اردو کی اشاعت و طباعت کی دشواریوں کے پیش نظر ایک پریس کی ضرورت کا احساس کیا گیا اور اس مقصد کے لئے انجمن اتحاد باہمی کی تشکیل ضروری سمجھی گئی۔ متعلقہ بائی لاز جن کا مسودہ تیار کر لیا گیا تھا منظور کئے گئے۔ مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپیہ رکھا گیا۔ ہر حصے کی قیمت پچیس روپے مقرر کی گئی۔ ادیب اور شاعروں کے علاوہ ان سے ہمدردی رکھنے والے حضرات بھی شیئر خرید سکتے ہیں، اور وہ زیادہ سے زیادہ بیس حصے خرید سکتے ہیں۔ مطلوبہ حصص کی رقم نواب عبدالوحید خاں غازی کامٹی کے پتہ پر بھیجی جانی چاہئے۔

اُردو ریسرچ ایسوسی ایشن دِلّی یونیورسٹی

انجمن تحقیقات اُردو کا جلسہ بورخہ ۴ر نومبر ۱۹۶۳ء کو زیرِ صدارت پروفیسر مسعود حسین خاں، صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد، شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔

پروفیسر نگیندر، ڈاکٹر نگیندر، صدر شعبۂ ہندی، دلّی یونی ورسٹی نے اردو میں "حالی بحیثیت تنقید نگار" کے عنوان سے ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ اپنے مقالے میں پروفیسر نگیندر نے حالی کے تنقیدی شعور کا تجزیہ کیا اور ہندی سنسکرت اور مغربی جمالیات کے اصولوں کی روشنی میں انھیں پرکھا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں حالی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر اخلاقی اور اصلاحی تھا اور ان کی حیثیت ماہر جمالیات سے زیادہ ادبی رہنما کی تھی۔ ان کی تصانیف میں ادب اور جمالیات کا کوئی نیا فلسفہ نہیں ملتا۔ البتہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اُردو تنقید کو ایک نیا موڑ دیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر نگیندر کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حالی کے تنقیدی مرقع پر سب سے اچھا مقالہ ہے جس میں سنسکرت اور مغربی فن جمالیات کے علم سے کام لے کر حالی کے تنقیدی نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے حالی کے بعض تنقیدی نظریات کے مآخذ سے بھی بحث کی۔

انجمن ترقی اُردو راجستھان کا اجلاس

جے پور ۳ر نومبر ۶۳ء۔ آج ۹ بجے دن انجمن ترقی اُردو راجستھان کا اجلاس زیرِ صدارت الحاج خان بہادر الطاف احمد صاحب قیصری منعقد ہو کر ۱۲ بجے تک رہا۔ حسبِ ذیل امور بالاتفاق طے کئے گئے۔

(۱) آل راجستھان اُردو سمینار و مشاعرہ جے پور کے انتظامات کا جائزہ لیا گیا اور مزید ذمہ داریاں مختلف اصحاب کے سپرد کی گئیں۔

(۲) مرکزی انجمن کے ترمیم شدہ دستور کی روشنی میں ریاستی انجمن نے اپنے دستور میں بالاتفاق ترمیم کی۔

(۳) مقامی شاخوں کو جنھوں نے سابقہ تحریر پر جدید انتخابات بموجب دستور مرکزی انجمن تین سال گزر جانے کے باوجود نہیں کرائے ہیں مکرر نوٹس دینا طے ہوا، اور قرار پایا کہ اگر ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء تک بھی انھوں نے انتخابات کرا کر مطلع نہ کیا تو وہ کالعدم تصور ہوں گی۔

(۴) ریاستی انجمن کا جدید دستور العمل یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے نفاذ پذیر ہوگا۔ (احترام الدین احمد شاغل)

دِلّی یونی ورسٹی میں بزمِ مشاعرہ

دلّی یونی ورسٹی۔ ۶ر نومبر ۱۹۶۳ء کو شعبۂ اُردو دلّی یونی ورسٹی کی "انجمن تحقیقاتِ اُردو" و "بزمِ ادب" کے زیرِ اہتمام پنڈت آنند نرائن مُلّا، سکندر علی وجد اور دوسرے نامور شعرا کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں جناب آنند نرائن مُلّا، حضرت بال مکند عرش ملسیانی، جناب سکندر علی وجد، پرویز شاہدی، حسن نعیم، مخمور سعیدی، ٹونکی شیو پرشاد وشسٹ، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مغیث الدین فریدی، شہاب جعفری اور کامل قریشی صاحبان نے شرکت کی اور اپنے بہترین کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا نے صدارت کی۔ (سکریٹری شعبۂ اُردو)

مالیگاؤں میں مشاعرہ

قصر الادب مالیگاؤں کے اہتمام میں ایک غیر طرحی مشاعرہ ندیم ادیبی کی صدارت میں ہوا۔ احمد نسیم مینا نگری اور ادیب مالیگانوی کی تقریروں کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ (نہال انصاری، سکریٹری قصر الادب)

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن کی سرگرمیاں

انجمن کے ایک وفد نے جو حافظ رفیق احمد صاحب، صدر الدین صاحب اور ساغر حیدر آبادی صاحب پر مشتمل تھا، ریجنل ڈائرکٹر تعلیمات آندھرا پردیش سے مل کر مندرجہ ذیل تعلیمی مسائل پر بات چیت کی۔

(۱) مدارس فوقانیہ شکر نگر میں اُردو داں اساتذہ و معلمات کی تعیناتی۔ (۲) مدرسہ فوقانیہ بودھن میں اُردو داں گریجویٹ اساتذہ کی تعیناتی۔ (۳) مدرسہ تحتانیہ بودھن میں جماعت سوم (ہندوستانی) کی بحالی۔ (۴) جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات کی تیاری کے لئے مدرسہ فوقانیہ شکر نگر کا ایک کمرہ رات کے وقت استعمال کرنے کی اجازت۔

ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب نے ہمدردانہ غور اور مناسب انتظام کا وعدہ فرمایا۔

بیت الادب میسور

"ادارۂ بیت الادب" میسور کی از سرِ نو تشکیل کی گئی ہے۔ فیض اللہ خاں صاحب فیض صدر، ڈی بشیر احمد صاحب نائب صدر، اقبال فریدی صاحب سکریٹری، سید عبد القادر صاحب مشتاق خازن متفقہ رائے سے چنے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی ۱۰۱ ویں برسی ۷ نومبر کو لال قلعہ کے دیوان عام میں سرکاری پیمانے پر بڑی شان شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ اس موقع پر ہمارے وزیر اعظم نے پُر اثر اور شاندار الفاظ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پنڈت نہرو کے داہنے ہاتھ پر ظفر کی ساٹھ سالہ پوتی شہزادی قمر سلطانہ بیٹھی تھیں۔ مقررین میں ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند شامل تھے۔

پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ بہادر شاہ ظفر اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے ہندوستان پر تین سو سال تک حکمرانی کی ہے۔ اس خاندان نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اگرچہ ان کے اجداد باہر سے آئے تھے لیکن بہت سے دوسرے غیر ملکیوں کی طرح وہ یہیں بس گئے اور ہمارے قومی ڈھانچے کا جزو بن گئے۔ اگرچہ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے ماضی کو بھول جائیں۔

ریلوے کے نائب وزیر جنرل شاہ نواز نے وہ واقعہ سنایا جبکہ نیتا جی سبھاش چندر بوس نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مقبرے پر سلامی دی اور رو پڑے۔ انھوں نے بہادر شاہ کے جسد خاکی کو ہندوستان میں لاکر لال قلعہ میں دفن کرنے کا مشورہ دیا۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب نے بہادر شاہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور ان کی قومی حیثیت کو سراہا۔ اس کے بعد ایک شاندار مشاعرہ ہوا جس میں ملک کے نامور اور ممتاز شعراء نے ظفر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ موسیقاروں نے پُر اثر انداز میں ظفر کی غزلیں سنائیں۔

مدھیہ پردیش ریاستی انجمن ترقی اردو

۲۷ اکتوبر کو دفتر ریاستی انجمن ترقی اردو میں مدھیہ پردیش کی ریاستی انجمن کی مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ الکشن افسر کے فرائض مولانا وجدی الحسینی نے انجام دیے۔ صدارت کے لئے حضرت کوثر چاند پوری کا نام مسٹر اشتیاق عارف نے پیش کیا جس کی تائید مندرجہ ذیل حضرات نے کی۔ شرقی عثمانی، مفتی صدیقی، سید اقتدار علی، محمد خاں (منگاؤلی)، قاضی جمیل الدین (آگر مالوہ)۔ کوئی دوسرا نام پیش نہیں ہوا۔ لہٰذا متفقہ طور پر حضرت کوثر چاند پوری صدر منتخب ہوئے اور ۲۷ اراکین پر مشتمل مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور آج یکم نومبر کو صاحب صدر نے عہدیداران کا اعلان کیا جو حسب ذیل ہے

عہدے داران:-

(۱) حضرت کوثر چاند پوری (شاخ بھوپال) صدر
(۲) مسٹر شرقی عثمانی　　نائب صدر
(۳) مفتی صدیقی　　"
(۴) مولانا وجدی الحسینی (شاخ ساگر) "
(۵) شری ہربنس سنگھ چاؤلا (شاخ ہردا) "
(۶) مسٹر ایم۔ عرفان (شاخ بھوپال) جنرل سکریٹری
(۷) سید اقتدار علی　　سکریٹری
(۸) محمد حسین خاں مہر (شاخ ساگر) "
(۹) سلطان احمد صدیقی (شاخ اجین) جوائنٹ سکریٹری
(۱۰) غلام محمد ٹھیکہ دار (شاخ عبید اللہ گنج) "
(۱۱) قاضی جمیل الدین صاحب (شاخ آگر مالوہ) "
(۱۲) مسٹر سید آفتاب الدین (شاخ بھوپال) خازن

اراکین:-

(۱۳) ڈاکٹر شفا گوالیاری (بھوپال)، (۱۴) مسٹر یوسف کھتری (ساگر)، (۱۵) مسٹر اشتیاق عارف (بھاگر)، (۱۶) محمد ظہور اللہ صاحب (ساگر)، (۱۷) اسیر صدیقی صاحب (ہردا)، (۱۸) حاجی محمد خاں صاحب (منگاؤلی)، (۱۹) حافظ قمر الدین صاحب (چندیری)، (۲۰) مسٹر اکبر علی (دیواس)، (۲۱) مسٹر ذوالفقار علی جعفری (دیواس)، (۲۲) مسٹر سید عبدالماجد (کھاچرودہ)، (۲۳) حاجی محمد صلاح الدین صاحب (برہان پور)، (۲۴) مسٹر حشمت اللہ انصاری (برہان پور)، (۲۵) عبد علی صاحب ایڈوکیٹ (اجین)، (۲۶) مسٹر غلام نبی شمیم (جھابوا)، (۲۷) مسٹر محمد مظفر حسین (رتلام)

انتخاب سے قبل مسٹر ایم۔ عرفان جنرل سکریٹری ریاستی انجمن نے (سابقہ) مجلس عاملہ کے سامنے دو سالہ رپورٹ پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی اور مسٹر ایم۔ عرفان کی خدمات کو ایک تجویز کے ذریعہ سراہا گیا جس کو مسٹر شرقی عثمانی نے پیش کیا اور تائید مولانا وجدی الحسینی نے کی۔ انتخاب کے بعد مندوبین کو عصرانہ اور رات کو ڈنر منجانب بستی کمیٹی اور ریاستی انجمن دیا گیا جس میں عزت مآب کل شیر احمد خاں وزیر قانون مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

قصر الادب کا سالانہ انتخاب

گزشتہ ماہ ادیب مالیگانوی کی صدارت میں قصر الادب مالیگاؤں کے سالانہ انتخابی جلسے ہوئے۔ مندرجہ ذیل حضرات کا انتخاب عمل میں آیا (۱) سرپرست، فضیل جمالی - (۲) صدر، نعیم ادیبی (۳) سکریٹری نہال انصاری اراکین مجلس عاملہ (۴) اختر ادیبی - (۵) تنویر ادیبی - (۶) رعنا ادیبی - (۷) عزیز ادیبی -

ڈاکٹر وحید اختر

تبصرے

تین شعری مجموعے [(۱) تمہاری باتیں (۲) رنگ و بو (۳) طلوعِ مہر]

"تمہاری باتیں" ع۔ م۔ سوز کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جسے مکتبۂ ماحول، کراچی نے شایع کیا ہے۔ اشعار کا نمونہ (بلا تبصرہ) یہ ہے:

وہ اگر ہمارے ہوتے تو کچھ اور بات ہوتی
ہم انھیں جو پیارے ہوتے تو کچھ اور بات ہوتی

غزل کی جاندار روایت شاعر سے نادانستہ طور پر بھی اچھے شعر لکھوا لیتی ہے اس لئے اس مجموعے میں جس کی قیمت ۳٫۵۰ تین روپے پچاس نئے پیسے ہے اچھے شعر بھی کہیں کہیں مل ہی جاتے ہیں۔

"رنگ و بو" خرد غوث پوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جو ایک کہنہ مشق استاد ابراحسنی گنوری کے شاگرد ہیں۔ اس مجموعے پر استاد کے علاوہ اور چار حضرات نے مقدمے لکھے ہیں ان پر مرتب ناظم گونڈوی کا اظہار حال مستزاد ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ ؎

ہیں نخلِ محبت میں ثمر ڈھونڈ رہا ہوں
یعنی تری الفت کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

استفادہ ہے خرد کو ابر سے شاعری کا رنگ ہے نکھرا ہوا

کتاب کے خاتمے پر "سرمۂ نور بصر" کا اشتہار بھی دیا گیا ہے۔ صرف کتاب کی قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے ہے، جس کے ملنے کے بہت سے پتے ہیں۔ مگر مکتبۂ گلستان ادب کلکتہ نے شایع کیا ہے۔

"طلوعِ مہر" حضرت محزوں جلکوی کا کلام ہے جو سمری بختیار پور مونگیر بہار سے شایع ہوا ہے، بغیر کسی جلد کے ۸۲ صفحات کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے، محزوں جلکوی صاحب نے ایک طویل ناول "رازِ عبرت" بھی قلمبند فرمایا تھا اور اس کی اشاعت کے لئے اس کا مسودہ اور مبلغ دو سو روپے زر پیشگی اپنے ایک کرم فرما کو روانہ کئے تھے مگر بقول شاعر مسودہ مع روپیہ کے ہضم ہو گیا۔ اب خدا خدا کر کے نظموں کا مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے چودھری محمود الحسن صاحب دعائے خیر کے مستحق ہیں۔ اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسی رباعیاں ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے:۔

ہنسانا چاہتا ہے کیوں جہاں کو کہ جب خود تیرا دل ہی رو رہا ہے

جگانا چاہتا ہے کیوں جہاں کو
کہ جب خود تو ہی غافل سو رہا ہے

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

مرتب۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن
ناشر۔ دار المصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ
سائز ۲۲×۲۹/۸ صفحات ۶۵۰
قیمت۔ مجلد ۱۱ روپے۔ غیر مجلد ۱۰ روپے

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

ناشر۔ دار المصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ
سائز ۲۲×۲۹/۸ صفحات ۳۰۴
قیمت۔ مجلد چھ روپے پچاس نئے پیسے
غیر مجلد پانچ روپے پچاس نئے پیسے

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ

مرتب۔ سید ضمیر حسن دہلوی
ناشر۔ حسن بک ڈپو۔ ۱۴۶۶ پہاڑی بھوجلہ، دہلی ۶
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۷۰

صبحِ بنارس

مرتب۔ عشرت کرت پوری
ناشر۔ اردو رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی۔ دہلی
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۷

انڈونیشیا

مصنف۔ شاہد حسین رزاقی
ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور (پاکستان)
سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۴۴۸
قیمت۔ سات روپے

پیغمبرِ انسانیت

مصنف۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی
ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)
سائز ۱۸×۲۲/۸ صفحات ۶۲۰
قیمت ۱۰ روپے

مخزن الولایت (اردو ترجمہ)

مرتب۔ منشی محمد ولایت علی عزیز
مترجم۔ محمد خصلت حسین صابری
ناشر۔ پاک اکیڈمی۔ ۱۴/۱ وحید آباد۔ کراچی ۱۸
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۸
قیمت۔ تین روپے

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شایع کیا